شعلۂ ظرافت

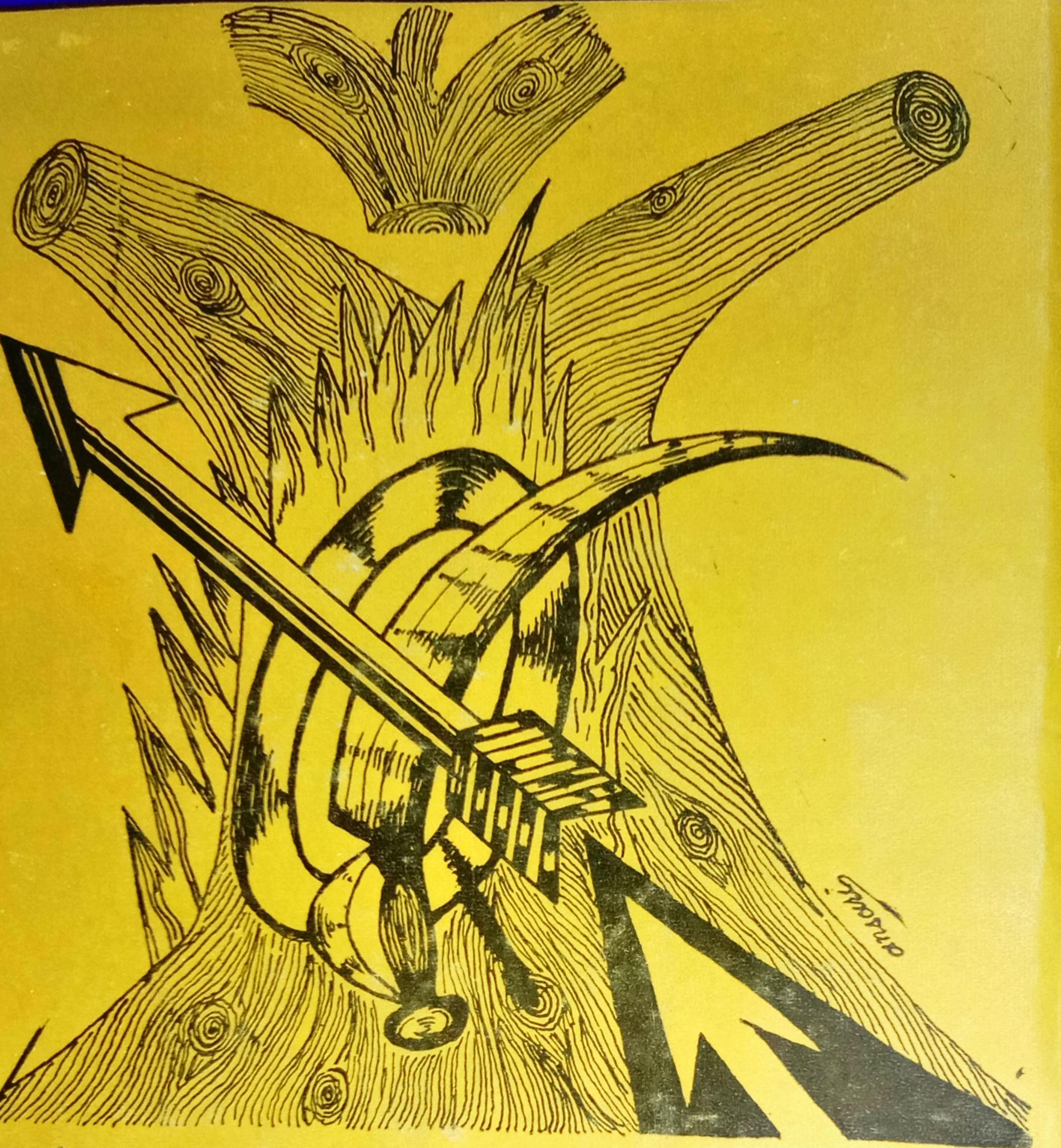

ابرار ساغر

شعلۂ ظرافت

(طنزیہ ومزاحیہ کلام)

ابرار ساغر

مرتّب

سیّد جاوید حیدر

© سیّد جاوید حیدر

یہ کتاب بہار اُردو اکیڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی

مصنّف : ابرار ساغر مرحوم

مرتب : سید جاوید حیدر

سرورق : نورالحسن انصاری

مطبع : نکھار پریس۔ مئو

طبع اول : نومبر ۱۹۸۳ء

تعداد اشاعت : ایک ہزار (۱۰۰۰)

قیمت : پندرہ روپے

(Rs. 15=00)

ملنے کا پتہ :-

سیّد جاوید حیدر

"حیدر ولا" شبیر شاہ روڈ، پٹنہ - ۷

ناشر :-

نکھار پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن، یوپی

ترتیب

شعلۂ مستعجل	رضا نقوی واہی
پیش لفظ	جاوید حیدر
حالاتِ زندگی	مرتب
مرثیہ ابرار ساغر	ہوش عظیم آبادی

ایک یادگار شادی
نقلی ڈاکٹر
کہاں جاتے
انفلائنٹس
بن بلائے مہمان
ترقی کی راہ
انٹلکچول
بے چارہ
ملاوٹ
رسوائیاں میری
لا اینڈ آرڈر

دل بدل
جے جے کار
تلاشِ رشتہ
ڈبلو۔ٹی
نیم حکیم
اجداد سے سیکھو
پاگلوں کی انجمن
مہنگائی اور شاعر
آبِ حیات اور بیکاری
جوتی خور عاشق
چندوں کی مہم
کھونٹے سے بندھا آدمی
قطعات

شعلۂ مستعجل

اس صدی کی ساتویں دہائی کی ابتدا میں ظریفانہ شاعری کے افق پر ایک ننھا منا ستارہ طلوع ہوا، جو ہر ساعت منوّر سے منوّر تر ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن افسوس، محض چند برسوں تک ہی اپنی چمک دمک دکھلا سکا تھا کہ یکایک فضائے بسیط میں ہمیشہ کے لیے تحلیل ہو گیا۔ اس شہاب ثاقب کا قلمی نام ابرار ساغر تھا۔ اگر جواں سال ابرار ساغر اسکوٹر اور منی بس کی سیدھی ٹکر میں حادثہ کا شکار نہیں ہو گئے ہوتے تو آج اردو کی ظریفانہ شاعری میں ایک اہم نام کا اضافہ ہوتا ہے

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

زیر نظر مجموعۂ کلام ابرار ساغر (مرحوم) کی چند ظریفانہ نظموں اور قطعات پر مشتمل ہے جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس چنگاری میں شعلۂ جوّالہ بننے کے امکانات کس قدر موجود تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس کلام پر اظہارِ خیال کروں، ظریفانہ شاعری کے تعلق سے چند باتیں عرض

کرنی چاہتا ہوں۔

میرا نظریہ یہ ہے کہ ادب میں سنجیدہ طنز و مزاح، فنِ تنقید کا ایک رُخ یا اسلوب ہے۔ کچھ لوگ طنز و مزاح کو شوگر کوٹیڈ (Sugar quoted) ادب کی کوئی صنف تسلیم کرنے میں تامل کرتے ہیں، کیونکہ بقول ڈاکٹر محمد حسن "ہمارے سماج میں ہنسنے ہنسانے کو بہ چشمِ نم دیکھا جاتا ہے۔ کوئی شریف آدمی ہشاش بشاش، خوش و خرم نظر آئے تو یوں سمجھا جاتا ہے، جیسے شارعِ عام پر کوئی سنگین جرم کرتے پکڑا گیا ہے۔ رونی صورت عموماً احترام سے دیکھی جاتی ہے اور جو جتنا سنجیدہ، رنجیدہ یا غم دیدہ نظر آئے گا، اتنا ہی بڑا مفکر، فلسفی یا عارفِ کائنات سمجھا جائے گا۔ اسی لئے رنج و غم نے فیشن کی شکل اختیار کر لی ہے اور ہمارے ادب اور فلسفے کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔" لیکن اس کے باوجود طنز و مزاح کو اپنی اہمیت منوانے کے لئے کسی سعی، سفارش یا بیسا کھی کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے بل بوتے پر اصنافِ ادب میں وہی درجہ رکھتا ہے جو دوسری کسی بھی صنف کو حاصل ہے۔ یعنی سنجیدہ ادب کے ساتھ سنجیدہ ظرافت کا بھی اپنا مقام ہے۔

مثل مشہور ہے کہ رونا اور گانا سب کو آتا ہے۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو، لیکن ہنسنا ہنسانا سب کو نہیں آتا۔ یہ وہ فنِ شریف ہے جو ریاضت چاہتا ہے اور ظرف و حوصلہ مانگتا ہے۔ اردو ادب کو یہ شرف حاصل ہے کہ طنز و مزاح کی روایت پرانی ہے اور اعلیٰ سطح کی بھی ہے۔ یہ اس کے ادبی مزاج کی شائستگی اور بالیدگی کا ثبوت ہے۔

آزادی کے بعد سے اب تک اردو پر جو قیامت گذری یا گذر رہی ہے، اس کے باوجود اردو دنیا ہنسنا ہنسانا نہیں بھولی اور اس کے قہقہے کھوکھلے

یا بے جان نہیں تھے۔ اس ہنسی میں زہرناکی بھی تھی اور فکر انگیزی بھی، دل سوزی بھی، دردمندی بھی۔ اعلیٰ طنز و مزاح فنکار کی درّاکی، قوتِ مشاہدہ اور قوتِ اظہار کا مرہونِ منّت ہوتا ہے۔ طنز و مزاح نگار سر کے بل کھڑا ہو کر دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرنے کے بجائے صرف دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے سے پردہ اٹھاتا ہے کہ وہ اردگرد کی ناہمواریوں کو دیکھ سکیں اور انکے مضحک پہلوؤں پر ہنس سکیں۔ طنز و مزاح کا تعلق معاشرت کے مسائل سے ہے۔ یہ بے معنی ہنسی کا نام نہیں۔ یہ گہرے عرفانِ ذات یا معاشرہ کے شعور سے پیدا ہوتا ہے جو ہر قسم کے کُوبڑ کا مذاق اڑا کر سماج میں صحت مند توازن کا متلاشی ہوتا ہے۔ طنز و مزاح زندگی کے المیہ سے گریز نہیں بلکہ اس کو خندہ پیشانی اور حوصلے کے ساتھ سہنا اور اس پر قابو پانا سکھاتا ہے۔ اسے برتنے کے لئے اوّل ایک حسّاس دل ہونا چاہیئے، اور پھر وہ قوتِ متخیّلہ جو بظاہر اَنمل بے جوڑ چیزوں میں ایک ربط و مناسبت تلاش کرکے اسے فنکارانہ طور پر قاری کے سامنے پیش کر دے۔ طنز و مزاح زبان کی بلوغیت اور شائستگی کا پیمانہ ہوتا ہے۔ اردو میں اس کا سرمایہ نہ صرف مقدار بلکہ معیار کے لحاظ سے بھی گراں مایہ ہے۔ جس طرح ایک مہذب مجلس میں کسی بے ادبی کی گنجائش نہیں ہوتی اسی طرح طنز و ظرافت کی صنف بھی کسی ابتذال، سطحی مزاح یا ادبی بے راہ روی کی متحمل نہیں ہوتی اور اس آبگینے کو پھوہڑپن یا ابتذال کی ٹھیس سے محفوظ رکھنا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ آج کے معاشرے کا کینوس اپنے مسائل اور مشاغل کے اعتبار سے بہت پیچیدہ، وسیع اور پہلو دار ہے۔ اس لحاظ سے معقولیت اور نامعقولیت کے تضادات کا میدان بھی بہت کشادہ ہوگیا ہے۔ ان پر سنجیدگی اور ہمدردی سے نگاہ رکھتے ہوئے اپنے کام کا مواد تلاش کرنا اہلِ ظرافت

کا اصل منصب ہے اور اس منصب کا حصول بہت مشکل بھی ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ مہذّب طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے میدان میں شعرا کی تعداد گویا نہیں کے برابر ہے، کیونکہ اس میدان میں قدم جمانا ہر کس و ناکس کے بس سے باہر ہے۔

اس مختصر سی تمہید کی روشنی میں، آیئے اب ابرار ساغر (مرحوم) کے اس مختصر تر پہلے اور آخری مجموعۂ کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے۔ مجموعہ کی پہلی نظم ہے "انٹلکچوئل"۔ ذرا سماج کے اس فرد کا حُلیہ ملاحظہ فرمایئے:۔

چندہ وصولنے میں جو ماہر ہو آج کل
کھاتا ہو جو عوام کے پیسوں کو بے خلل
ہے قوم کی نظر میں وہی مردِ باعمل
اس سے بڑا نہیں ہے کوئی اِنٹلکچوئل

ملت کا درد لے کے پھرے جو نگر نگر
آنکھوں میں رس پیاز کا دو بوند ڈال کر
کھائے ڈنر جو قوم کے غم میں بہ چشم تر
اس سے بڑا نہیں ہے کوئی اِنٹلکچوئل

جس کے ہر اک عمل میں نہاں کوئی راز ہو
جس کا دماغ فتنہ گر و فتنہ ساز ہو
جس کی زباں فراق کی شب سے دراز ہو
اس سے بڑا نہیں ہے کوئی اِنٹلکچوئل

دوسری نظم ہے "ملاوٹ" آج کل ہمارے ملک میں ملاوٹ کا

کاروبار جس تیزی سے فروغ پا رہا ہے، اس کا تجربہ عوام و خواص سب کو ہو رہا ہے
ابرار ساغر کی زبانی اس کاروبار کا کچھ حال ملاحظہ ہو ؎

ہے ملاوٹ دیش کی سب سے بڑی انڈسٹری
ہے اسی صنعت میں اپنی 'ورلڈ میں مونوپلی
مختصر مدت میں دولت مند بننا ہو اگر
دوسرا بزنس کوئی ایسا نہ ہوگا کارگر
دودھ پانی میں ملانے کی روایت ہے کہن
نت نئی آمیزشوں کا بڑھ چلا ہے اب چلن
ہے دواؤں پر توجہ اس ملاوٹ میں سوا
ہے یہ ناممکن مریضوں کو ملے خالص دوا
کوئی بے چارہ وٹامن سی کی کھا کے گولیاں
مبتلائے ڈائی بیٹیز ہو گیا اکدم یہاں
کیمیائی تجربہ سے بات یہ واضح ہوئی
جس کو سمجھا تھا وٹامن سی تھی چینی کی ڈلی

ایک نظم ہے "نقلی ڈاکٹر" یہ ایک پی ایچ. ڈی کی داستان ہے
چور دروازے سے لکچرر شپ ملی تھی. کلاس میں لڑکوں کو پڑھاتے وقت
عجیب و غریب انکشافات کیا کرتے تھے. مثلاً ؎

کہتے تھے میرؔ اُلٹیاں کر کر کے مر گیا
بیچارہ ڈاکٹر بھی مداوا نہ کر سکا
غالبؔ کو آپ کہتے تھے، استادِ میر تھے
اقبالؔ ایک مرثیہ گو تھے بہت بڑے

انھیں پی ایچ. ڈی بننے کا جب شوق ہوا تو ایک پلیشیہ ور تھیسس نگار

بن گئے، تو بجائے پانچ سو کے ڈھائی سو روپے دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بات کھل گئی سے پانچ سو روپے پر بات طے ہوئی۔ لیکن جب تھیسس داخل کر کے وہ ڈاکٹر

طینت میں بد معاملگی کی مگر تھی لت
تھی بات پانچ سو دیئے ڈھائی سو فقط
جھگڑے نے لین دین کے الٹا کیا اثر
یہ بات عام ہو گئی نقلی ہے ڈاکٹر

ایک نظم "کہاں جاتے" کے چند اشعار سنئے

الکشن میں کھڑے ہوتے تو ہم جانے کہاں جاتے
بگڑتا اس طرح حلیہ کہ پہچانے کہاں جاتے
ہوس میں ممبری کی ناک کٹوانے کہاں جاتے
کھڑے ہو کر ضمانت ضبط کروانے کہاں جاتے
تمھارے کارنامے کیا ہیں جب یہ پوچھتے ووٹر
تو ہم غزلوں کی کاپی ان کو دکھلانے کہاں جاتے
یہ مانا گھر کے اندر ڈانٹ ہم سننے کے عادی ہیں
الکشن میں سرِ بازار پٹ جانے کہاں جاتے
چلو اچھا ہوا خبطِ الکشن دل سے تو نکلا
حجامت ووٹروں سے اپنی بنوانے کہاں جاتے

اسی الکشن کے سلسلے کی ایک اور نظم "رسوائیاں میری" سنئے
جس کے اکثر اشعار میں اقبال کے مصرعوں پہ مصرعے لگا کر پیروڈی کی اچھی

مثال پیش کی گئی ہے

ٹکٹ کے واسطے کیا کیا ہوئیں رسوائیاں میری
"نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری"

منافع خور، اسمگلر بھی ہوں اور دل بدل بھی ہوں
مری درخواست میں تھیں درج ساری خوبیاں میری

کسی کم بخت نے ترچھی نظر سے بھی نہیں دیکھا
اٹیچی میں دھری ہی رہ گئیں کل ڈگریاں میری

کوئی سنتا نہ تھا میری سبھی تھے اپنے چکر میں
"وہاں تو بات کرنے کو ترستی تھی زباں میری"

میں کس کس سے ملا کس کس نے دروازے پہ دھتکارا
"چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری"

نئی دہلی سے میں ناکام جب سے لوٹ آیا ہوں
"خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری"

ٹکٹ ہی ہو سکا حاصل نہ رسوائی سے بچ پایا
"حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری"

یہ چند جھلکیاں ہیں ابرار ساغر کے فکروفن کی۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر موت اس نوجوان کو مہلت دیتی تو ہماری سنجیدہ ظریفانہ شاعری میں کتنا خوشگوار اضافہ ہوا ہوتا۔

رضا نقوی واہی

پیش لفظ

یکم فروری ۱۹۸۰ء کا دن وہ قیامت کا دن تھا جس دن میرے بڑے بھائی اور اردو ادب کے جواں سال مزاحیہ شاعر ابرار ساغر ایک سڑک حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ ابرار ساغر (مرحوم) کی نظمیں "بیسویں صدی" جیسے اعلیٰ معیار کے رسالہ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ کئی بار انھوں نے آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے بھی اپنا پروگرام پیش کیا۔

یہ کتاب "شعلۂ ظرافت" ان کی مزاحیہ نظموں کا مجموعہ ہے جو بہار اردو اکادمی کی مالی امداد سے شائع ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں اس

مجموعہ میں مرحوم کی تمام نظمیں شامل ہیں۔

اس کتاب کے شائع ہونے میں جناب رضا نقوی واہی صاحب، جناب عبدالمغنی صاحب اور جناب عبید قمر صاحب کا تعاون مجھے ملا جس کے لئے میں ان لوگوں کا شکرگزار ہوں۔ خاص کر جناب عبید قمر صاحب کا تعاون قابلِ ذکر رہا ہے جنھوں نے اس کتاب کے شائع ہونے میں کافی دلچسپی دکھائی اور اس میں میری بہت مدد کی۔ اس کے لئے میں خاص طور پر انکا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آخر میں گزارش ہے کہ جن حضرات کو یہ کتاب ملے وہ برائے مہربانی ایک سورہ فاتحہ کا ثواب جناب ابرار ساغر مرحوم کی روح کو ہدیہ کر دیں۔

سیّد جاوید حیدر

"حیدر ویلا"

شیر شاہ روڈ۔ پٹنہ ۔ ۷

حالاتِ زندگی

نام :- سیّد ابرار حیدر
تخلص :- ساغرؔ
قلمی نام :- ابرار ساغرؔ
"حیدر ویلا" پٹنہ - ۷
والد :- سیّد عزیز حیدر کجھوئی
ملازمت :- بہار ودھان سبھا
تاریخ پیدائش :- دسمبر ۱۹۴۷ء
تعلیم :- بی - اے آنرز (فلسفہ)
شرفِ تلمذ :- جناب رضا نقوی واہیؔ - جناب ہوش عظیم آبادی

سید ابرار حیدر ساغر دسمبر ۱۹۴۷ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ مسلم ہائی اسکول پٹنہ میں حاصل کی۔ وہاں سے فراغت کے بعد کالج آف کامرس پٹنہ سے .B.Com کیا اور اس کے بعد بہار یونی ورسٹی سے فلسفہ میں آنرس کی ڈگری لی۔

۱۹۷۲ء سے بہار ودھان سبھا میں ملازم ہوئے۔ شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۸ء سے ہوا۔ اس کے بعد مسلسل مزاحیہ کلام تخلیق کرتے رہے ان کی نظمیں ماہنامہ "شگوفہ" "بیسویں صدی" اور پٹنہ کے مقامی رسالوں میں اکثر و بیشتر چھپتی رہی ہیں۔ ابرار ساغر کی پہلی مزاحیہ نظم "ایک یادگار شادی" تھی جو کافی مقبول ہوئی۔

ابرار ساغر جب یکم فروری ۱۹۸۰ء کو آفس کے کام سے پٹنہ جی پی او جا رہے تھے تو اسکوٹر اور منی بس کی ٹکر میں ہلاک ہو گئے۔ ابرار ساغر مرحوم کی آخری نظم "انفلائٹس" تھی۔ جو انھوں نے حادثہ کے کچھ ہی ماہ قبل کہی تھی۔ مرحوم کی کچھ نظمیں مثلاً "انٹلکچول"۔ "ملاوٹ"۔ "نقلی ڈاکٹر"۔ "رسوائیاں میری" وغیرہ کافی مشہور ہوئیں۔ ●●

مرتبا

ہوش عظیم آبادی

مرثیۂ ابرار ساغر مرحوم

جائے عبرت ہے یا اولی الابصار
ہوش کرتا ہے ماتمِ ابرار

حادثہ کیا عدوئے جانی تھا
موجبِ مرگِ ناگہانی تھا

میرے مرحوم دوست کے دلبند
کر گیا تجھ کو خاک کا پیوند

سارے کنبہ سے دفعتاً چھوٹا
راہ میں تجھ کو موت نے لوٹا

فرصت از کارِ منصبی پائی
گھر میں دفتر سے تیری لاش آئی

پھول سہرے کے مسکرا نہ سکے
نوعروسی کے دن بھی آ نہ سکے

رختِ شادی ہوا نہ زیبِ بدن
موت ظالم کھڑی تھی لے کے کفن

حجلۂ نوعروسی کے بدلے
کنجِ مرقد ملا تجھے ہے ہے

جتنی تیاریاں تھیں شادی کی
ہو گئیں نذر نامرادی کی

سارا ارمان کھو گیا ابرار
ماں کا دل خون ہو گیا ابرار

جس طرف بھی نگاہ مڑتی ہے
چشمِ مادر میں خاک اڑتی ہے

غم نے چاروں طرف سے گھیرا ہے
تا بہ حدِ نظر اندھیرا ہے

بھائیوں کا ہے تیرے حال بُرا
دل سے بہنوں کے اٹھ رہی ہے کر

تھا تصوّر نہ اس جدائی کا
شکوہ کس سے ہو بے وفائی کا

سب ترے غم میں جان کھوئے ہیں
اپنی قسمت میں آپ روئے ہیں

ایک یادگار شادی

یارو مبالغہ کا نہیں اس میں کچھ گماں
احوالِ واقعی ہیں جو کرتا ہوں میں بیاں
شادی تھی ایک دوست کی گوپال پور میں
وہ گاؤں جس کا شہرہ ہے نزدیک و دور میں
مشہور ہیں فضا نے بہت حسن دیار کے
رہتے ہیں منتخب ہی جہاں روزگار کے
نوشہ کے ساتھ گاؤں میں داخل جو ہم ہوئے
بھر تماشہ لوگ وہاں کے بہم ہوئے
یوں گھورتے تھے جیسے کہ ہم زو سے آئے ہیں
نوشہ حضور چند عجوبے بھی لائے ہیں

القصہ جب نکاح کی محفل ہوئی تمام
کچھ شاعروں نے پیش کیا بے سُرا کلام
تھا موقع و محل کا کسی کو نہ کچھ خیال
بھانڈوں نے بھی دکھایا اچھل کود کر کمال
بچے ذہین پر دبیز جو پردے پڑے ہوئے
بیٹے کا سہرا پڑھنے کو باوا کھڑے ہوئے
بعد اس کے آئی سامنے جب منزلِ طعام
سمجھے یہ ہم کہ ہو گئی اب بوریت تمام
سلگی ہوئی تھیں بھوک سے آنتوں کی بھٹیاں
منظر ہر ایک پیشِ نظر تھا دھواں دھواں
کھانے کا نام سنتے ہی دل کو ہوا قرار
باراتیوں کے رُخ سے دُھلی گردِ انتشار
دھو دھو کے ہاتھ فرش پہ بیٹھے جوں ہی مگر
اک منظرِ عجیب سے ٹکرا گئی نظر
مٹی کے قاب اور اسی کی سفالیاں
باراتیوں کے آگے رکھی تھیں یہاں وہاں
تاڑی کے چکڑوں میں تھا تکڑ دھرا ہوا
کلہیوں میں سب کے سامنے پانی بھرا ہوا
باراتیوں کے غول میں بستی کے لوگ بھی
گھس آئے تھے اگرچہ کہ مدعو نہ تھا کوئی
کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یکسر گنوار تھے

شائستگی کے سر پہ لیے لٹھ سوار تھے
چمچے ہے کس دیے انھیں مطلق نہ تھی خبر
ہاتھوں سے پل پڑے وہ پلاؤ پہ ٹوٹ کر
پھر منہ چلا کے کھانے لگے یوں سپڑ سپڑ
جیسے پولیس کرے کسی بلوے میں دھر پکڑ
چکر میں چائے پینے پہ مجبور ہم ہوئے
بے جرم و بے گناہ ہی مقہور ہم ہوئے
چائے بھی وہ کہ جس میں نہ چینی تھی نام کو
ایسی کڑی کہ جس جو کر دے زکام کو
اس حسنِ انتظام پہ قربان جایئے
کتنے ذہین لوگ ہیں یہ جان جایئے
باراتیوں کے ساتھ جب ایسا سلوک ہو
کیوں ہم سے اس مقام پہ جانے کی چوک ہو
داماد کی تلاش میں سر مارتے رہیں
ہم نوجواں کبھی بھی ادھر کا نہ رُخ کریں

●

(مطبوعہ: "شگوفہ" سالنامہ ۱۹۷۶ء حیدرآباد)

نقلی ڈاکٹر

سنتا ہوں بھوت مار کے ڈر سے ہے بھاگتا
لیتا ہے اپنے شہرِ خموشاں کا راستا
ہے بھوت عز و جاہ کا کچھ مختلف مگر
نالائقوں کے سَر کو سمجھتا ہے جو کھنڈر
قبضہ جمائے رہتا ہے دن رات بے خطر
حربہ کوئی بھی ہوتا نہیں اس پہ کارگر
اس کے شکار ایک مقامی تھے لکچرر
مرتے تھے جو کہ خواہشِ نام و نمود پر
تھانہ کمیٹی روز بناتے تھے اک نئی
محدود تھی محلّے تلک ان کی لیڈری
چمچہ گری کے فن میں وہ ہشیار تھے بڑے
پیدائشی لنک انھیں کہتے تھے دل جلے

فہم و ذکا ر کا ان کے جہاں تک سوال تھا
بچے بھی ٹھیک سے کرنا محال تھا
کہتے تھے میر الٹیاں کر کر کے مرگیا
بے چارہ ڈاکٹر بھی مداوا نہ کر سکا
غالب کو آپ کہتے تھے استادِ میر تھے
اقبال ایک مرثیہ گو تھے بہت بڑے
فرماتے میر انیس قصائد کے تھے دھنی
سودا کی شاعری میں رومانیت بھری
دل میں خیال ان کے سمایا یہ ایک بار
پی ایچ ڈی کے گروہ میں میرا بھی ہو شمار
اپنی صلاحیت سے جو واقف تھے آپ ہی
گانٹھی اک ایسے شخص سے حضرت نے دوستی
تھیسس لکھے جوان کے لئے لیکے روپے
القصہ جوڑ توڑ سے وہ ڈاکٹر بنے
طینت میں بد معاملگی کی مگر تھی لت
تھی بات پانچ سو کی دئے ڈھائی سو فقط
جھگڑے نے لین دین کے الٹا کیا اثر
یہ بات عام ہوگئی نقلی ہے ڈاکٹر

●

"صبح نو" پٹنہ

کہاں جاتے

الکشن میں کھڑے ہوتے تو ہم جانے کہاں جاتے
بگڑتا اس طرح حلیہ کہ پہچانے کہاں جاتے
ہوس میں ممبری کی ناک کٹوانے کہاں جاتے
کھڑے ہو کر ضمانت ضبط کروانے کہاں جاتے
تمھارے کارنامے کیا ہیں جب یہ پوچھتے ووٹر
تو ہم غزلوں کی کاپی ان کو دکھلانے کہاں جاتے
وہ ہوٹل بند ہے جس میں کریڈٹ اپنا چلتا تھا
ہم اپنے ورکروں کو چائے پلوانے کہاں جاتے

یہاں تو جیب خالی تھی کوئی کیوں ہم نو بنتا
کرایہ پر جلوس اپنا نکلوانے کہاں جاتے
جٹانے کو ضمانت کی رقم بیگم نفیس آمادہ
پہ نقلی زیوروں کو رہن رکھوانے کہاں جاتے
جماعت ورکروں کی شاعروں پہ مشتمل ہوتی
ہم ان کی شاعری جنتا کو سنوانے کہاں جاتے
کوئی ورکر جو ضد کرتا مجھے چھپوا ایئے پہلے
کلام اس کا لئے پرچوں میں چھپوانے کہاں جاتے
یہ مانا گھر کے اندر ڈانٹ ہم سننے کے خوگر ہیں
الکشن میں سر بازار پٹ جانے کہاں جاتے
چلو اچھا ہوا خبطِ الکشن دل سے تو نکلا
حجامت ووٹروں سے اپنی بنوانے کہاں جاتے
الکشن میں کھڑے ہوتے تو سروس چھوڑنا پڑتی
میاں ابرار ساغر ٹھوکریں کھانے کہاں جاتے

●

انفلائنٹس

آگیا یوپی سے جب پٹنہ میں انفلائنٹس
ڈاکٹر حضرات اپنی جیب گرمانے لگے
احتیاطی کارروائی کاغذی ہونے لگی
مچھروں کے خوف سے انسان تھرّانے لگے
جو دوا جاپان سے آئی تھی یو.پی کو ملی
ہم امیدوں کے سہارے ہی شفا پانے لگے
ڈاکٹر کہتے تھے بیماری کی جڑ ہے گندگی
بلدیہ والے یہ سُن کر طیش میں آنے لگے

ان کا کہنا تھا غلاظت تو ہے عینِ زندگی
بے سبب کیوں اہلِ پٹنہ اس سے گھبرانے لگے
جیتے آئے ہیں سدا جو گندگی کے ڈھیر پر
کیوں صفائی پر وہ اتنا زور فرمانے لگے
گر گلی کوچوں سے مانا ہٹ بھی جائے گندگی
فائدہ ہے کیا نہیں ہٹتا جو ذہنوں سے غبار
مچھروں کو اسپرنگ مارڈ اے گی مگر
وائرس ہیں اور بھی ذہنوں کے اندر بے شمار
وائرس کا ہی کرشمہ ہے یہ فرقہ واریت
آدمی کرتا ہے اکثر آدمی ہی کا شکار
مرد و زن پیر و جواں کی کچھ نہیں رہتی تمیز
آگ نفرت کی بھڑک اٹھتی ہے جب بے اختیار
ذبح ہو جاتا ہے انساں بھیڑ بکری کی طرح
خون سے خاکِ وطن ہوتی ہے اکثر لالہ زار
وائرس مہلک ہے انفلائٹس سے زیادہ ہوا
مارنے کا اس کو کرنا چاہیئے کچھ انتظام
بلدیہ والے سڑک کی گندگی کر دیں گے دور
پہلے ذہنوں کی کدورت دور تو کر لیں عوام

بن بلائے مہمان

میرے پڑوسیوں میں تھے اک شخص باوقار

بیٹے خدا نے جن کو عنایت کئے تھے چار

نازاں محلے والے تھے ان کے وجود پر

اپنے خلوص سے وہ دلوں میں کئے تھے گھر

رہتے تھے پیش پیش ہر ایک قومی کام میں

مقبول اس لئے وہ بہت تھے عوام میں

منجملہ خوبیوں کے برائی تھی اک مگر

گرتی تھی رال مرغ پلاؤ کے نام پر

دعوت اڑانا ان کا تھا محبوب مشغلہ

رہتے تھے روز و شب وہ اسی دھن میں مبتلا

دعوتیں
ختنہ بیاہ شادی کی کھاتے تھے دعوتیں
اکثر وہ بن بلائے اڑاتے تھے دعوتیں
اک روز جب وہ بیٹھے تھے رنجور و دل حزیں
یہ غم لیے پلاؤ نہیں ملتا اب کہیں
اک دوست کو جو سوجھی شرارت تو یہ کہا
بے کار غم میں ہوتے ہو کیوں یار مبتلا
تقریبِ شادی آج میرے گھر کے ہے قریں
اپنے پرائے کی وہاں کچھ شرط بھی نہیں
دعوت اڑاؤ اور مجھے بھی دعائیں دو
اچھا تو اب میں چلتا ہوں تم آنا شام کو
مژدہ یہ سُن کے چہرہ مسرت سے کھل گیا
گویا کہ ان کو گوہرِ مقصود مل گیا
تقریب میں جو پہنچے تو منظر ہی اور تھا
یعنی کہ رسمیں ختم تھیں کھانے کا دور تھا
کھانے پہ حملہ ور ہوئے فوراً یہ دیکھ کر
یکبار بھی نگاہ نہ کی گرد و پیش پر
جب کھا چکے تو صاحبِ خانہ سے یہ کہا
روزِ سعید ایسا خدا لائے بار بار
دختر کی کتخدائی مبارک ہو آپ کو
یہ دن خدا دکھائے ہر ایک ماں باپ کو
دولہا میاں کہاں ہیں ذرا ان کو دیکھ لوں

پھر پان وان آپ کھلائیں تو میں چلوں
سُنکر سخن یہ غیظ میں موصوف آ گئے
آثار برہمی کے سر و پا پہ چھا گئے
غصّے میں کانپتے ہوئے چلّا کے یہ کہا
مجھ سے مذاق کرتا ہے کھا کر او بے حیا
خاموش ہو کہ ضبط کا یارا نہیں مجھے
بیہودہ گوئی تیری گوارا نہیں مجھے
تقریب ہے یہ کیسی نہیں تجھ کو گر پتہ
سُن لے کہ میری بیٹی کی ہے آج فاتحہ
بیچارے ڈانٹ سنتے ہی خاموش ہو گئے
خفّت ہوئی کچھ اتنی کہ روپوش ہو گئے

چکّر میں دوستوں کے اب آتے نہیں ہیں وہ
مدعو بھی گر کہیں ہوں تو جاتے نہیں ہیں وہ

●

("شگوفہ" حیدرآباد)

ترقی کی راہ

ماتحت کو ایک افسر نے معطّل کر دیا
ایک جنبش سے قلم کی دور کس بل کر دیا
ماتحت تو تھا گرانی پر بڑا منہ زور تھا
اس کی بکواسوں سے آفس کا ہر افسر بور تھا

کاغذی کاموں سے دلچسپی اسے مطلق نہ تھی
اس کے ٹیبل پر مہینوں رہتی تھی فائل پڑی
کھا کے کھینی تھوکنا ہی کام تھا اس کا فقط
بھانگ گانجہ اور تھی افیون کی بھی اسکولت
پیٹ پتروں کا ہوتا ہی نہ تھا کچھ بھی اثر
انتہا یہ ہے کہ میمو کا بھی تھا اس کو نہ ڈر
سُن ڈانٹیں افسروں کی چُپ نہیں رہتا تھا وہ
ایک سنتا تھا اگر دس بات کہہ دیتا تھا وہ
دھاندلی جب ماتحت کی بڑھ گئی حد سے سوا
دفعتاً افسر کو بھی ایک دن جلال آ ہی گیا
پھر تو چالو کارروائی ہو گئی اس کے خلاف
ماتحت بیچارہ ساری بھول بیٹھا لام قاف
مختصر یہ کہ سسپنشن کا پروانہ ملا
یا بہ الفاظِ دِگر بیہودہ گوئی کا صِلہ
پھر تو بیچارے کی بس تنخواہ آدھی رہ گئی
ٹیری کاٹن کی جگہ پوشاک کھادی رہ گئی
کھادی ٹوپی نے دکھایا خوب ہی اپنا کمال
دیکھتے ہی دیکھتے وہ بن گیا جنتا کا لعل
پھر چناؤ کا زمانہ جب سروں پہ آ گیا
قوم کی خدمت کے جذبے سے کھڑا وہ بھی ہوا
آدمی بکواس کرنے میں تو تھا ہی لاجواب